عہدنبویؐ: اعتدال اور توازن کا بہترین نمونہ

ڈاکٹر نثار احمد

اُمت مسلمہ کی شناخت اور اس کی پہچان جہاں اس کے اللہ کے پیغام کے علَم بردار ہونے کی حیثیت سے ہے وہیں اس کا دوسرا اور لازمی وصف قرآن نے اُمَّۃً وَّسطًا کے زریں الفاظ میں واضح کیا ہے:

قُلْ لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ط یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا ○ (البقرہ ۲:۱۴۲-۱۴۳) اے نبیؐ! ان سے کہو مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔ اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک 'اُمتِ وسط' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔

واضح رہے اُمتِ وسط سے مراد ایک ایسی قوم اور انسانوں کا ایک ایسا گروہ ہے جو فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر عدل و انصاف اور توسط اور میانہ روی کی روش پر قائم ہو، اور جس کا تعلّق سب انسانوں کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلّق ہو اور کسی سے بھی ناحق اور ناروا تعلّق نہ ہو۔ اس کے برعکس انتہاپسندی وہ روش ہے جو راہِ وسط کی ضد ہے۔

انتہاپسندی کے الفاظ بجاے خود شدت و حدّت کو ظاہر کرتے ہیں۔ انتہا کے لفظی معنی ہیں کسی چیز کی آخری حد یا کنارہ۔ کسی دائرے کا آخری گھیرا، کسی صفحے کی آخری لکیر، کسی وسعت کا احاطہ کلّی، خاتمہ، روک یا آخری سرا، جو اسے کسی دوسری حد اور انتہا سے ممتاز و ممیّز کردے۔ حد وانتہا

مادی شکل کی بھی ہوسکتی ہے اور معنوی بھی۔ نیز حدو انتہا کے واقعتاً دو رُخ ہو سکتے ہیں: ایک کم سے کم یا نیچے کی حد یا آخری لکیر سے گر جانا، اور ایک حدونہایت یا غایت وانتہا اُوپر کی طرف، حد سے اُوپر گزر جانا، دائرے سے باہر نکل جانا۔ گویا انتہاپسندی کا اصولاً اطلاق زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم دونوں صورتوں پر ہوسکتا ہے، یعنی افراط اور تفریط دونوں شکلوں میں۔ ان دونوں انتہاؤں (کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ) کے درمیان یا وسط (بیچ)، عدل وقسط اور اعتدال کی منزل ہے۔

روزمرہ گفتگو میں جب انتہاپسندی کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس سے عُرفاً اور عموماً حداعلیٰ و بالا کی طرف ہی بڑھ جانے یا گزرجانے کا اشارہ ہوتا ہے، یعنی سیاسی، معاشی، معاشرتی یا مذہبی کسی بھی معاملے میں حد سے آگے بڑھ جانا۔ حد سے آگے بڑھنے کا رجحان ومیلان جسے ہم انتہاپسندی کہتے ہیں، دراصل عدل واعتدال کو خاطر میں نہ لانے اور وسط وقسط ترک کردینے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اگرچہ 'انتہاپسندی' کا لفظ استعمال نہیں ہوا، تاہم انتہاپسندی کی نمایندگی اور اس کی کیفیت وکمیت کا اظہار دوسرے کئی الفاظ واصطلاحات سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ چنانچہ حدِاعتدال سے آگے بڑھ جانا، یعنی انتہاپسندی دراصل حدود شکنی ہے، ظلم وزیادتی ہے اور اسی کو غُلو کہا گیا ہے، یعنی مبالغہ کرنا، حد سے آگے بڑھنا، جب کہ یہی طغیان، اعتدیٰ، افراط اور عدوان ہے۔[1] چنانچہ قرآنِ پاک میں یہ نمایندہ الفاظ واصطلاحات جہاں جہاں پائے جاتے ہیں ان کے سیاق وسباق سے پتا چلتا ہے کہ انتہاپسندی سے ظلم وزیادتی جنم لیتی ہے، جبروجور بڑھتا ہے، تشدد وتغلب پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں قتل وغارت گری، فتنہ وفساد پورے معاشرے میں پھیل جاتا ہے جس کا مشاہدہ ہم آج خود اپنے ملک میں آئے دن کرتے رہتے ہیں۔

انتہاپسندی کا میلان ورجحان یا رویہ خواہ دینی، دنیوی کسی معاملے میں ہو یا انسانی زندگی کے کسی بھی شعبے میں پایا جائے بہرحال عقل ونقل کسی اعتبار سے پسندیدہ نہیں، بلکہ قابلِ مذمت اور انتہائی خطرناک ہے اور مختلف درجات میں مہلک نتائج کو جنم دیتا ہے۔ انتہاپسندانہ رویہ بنیادی طور پر بے اعتدالی اور بے راہ روی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تاہم اور دوسرے بہت سے اسباب کا بھی اس میں عمل دخل ہوتا ہے، مثلاً بعض لوگ طبعاً انتہاپسندانہ طبیعت لے کر پیدا ہوتے ہیں اور انتہاپسندی ان کی سرشت میں ہوتی ہے، جیسا کہ سورۂ علق (آیت ۶) میں فرمایا گیا: كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى

(بے شک انسان حد سے نکل جاتا ہے۔ ترجمہ: تھانوی)۔

انتہاپسندی کی ایک وجہ لاعلمی، ناواقفیت اور جہالت ہے۔ حدود و قیود سے ناواقفیت بجاے خود حدوں کی پامالی اور ان سے تجاوز کا باعث بنتی ہے اور جہالت میں اکھڑپن، ناشائستگی، عدم برداشت، تشدد اور تغلب سب چیزیں داخل ہیں جو بالآخر انتہاپسندی پر منتج ہوتی ہیں۔ علم، طاقت، عزت، دولت، علم، عقل وغیرہ اگرچہ عطیۂ خداوندی ہیں لیکن اکثر اوقات آدمی اس زعمِ باطل میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ یہ اس کے کسب و محنت کا نتیجہ اور ملکیت ذاتی ہے۔ پھر فخر، غرور، گھمنڈ میں آکر انا ولاغیری کا خبط اس پر سوار ہوجاتا ہے اور وہ انتہاپسندی کی انتہا پر پہنچ کر اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی (النازعات ۷۹:۲۴، میں ہوں رب تمھارا سب سے اُوپر۔ ترجمہ: محمودالحسن) کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ یہی فرعونیت ہے۔ قرآن میں مختلف حوالوں سے فرعون کا تقریباً ۷۴ مرتبہ ذکر آیا ہے لیکن اس کی فردِ جرم میں مرکزی شق ہے: اِنَّهٗ طَغٰی (طٰہٰ ۲۰: ۲۴،۴۳، النازعات ۷۹:۱۷) کہ وہ حد سے بہت بڑھ گیا تھا۔ انتہا کی انتہا کو پہنچ گیا تھا جس کی مزید تشریح یہ کی گئی کہ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ○ (یونس ۱۰:۸۳) (اور فرعون ملک میں متکبر و متغلب اور (کبر و کفر میں) حد سے بڑھا ہوا تھا۔ ترجمہ: ف م جالندھری)۔ اور فرمایا گیا: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ (القصص ۲۸: ۴) (بے شک فرعون نے بہت سر اُٹھا رکھا تھا)۔ اس انتہاپسندی کے نتیجے میں اسے نشانِ عبرت بنادیا گیا (النازعات ۷۹:۲۶)۔

انتہاپسندی کے فروغ و افزایش میں بعض اوقات ذاتی غرض و منفعت، حب جاہ و مال و منصب بھی کارفرما حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ چنانچہ وسائل و ذرائع میں جائز و ناجائز، حق و باطل، صحیح غلط کا امتیاز بے معنی ہوجاتا ہے۔ پھر ضد، ہٹ دھرمی، انتقام، انانیت، انتہاپسندی کی راہوں کو پُرپیچ بناکر انسانیت کو تباہی و ہلاکت سے دوچار کردیتی ہیں۔ اس پہلو سے انتہاپسندی اور دہشت گردی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا کیونکہ دونوں کا بظاہر نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا انسانیت، شرافت اور معاشرتِ باہمی کی خیر اسی میں ہے کہ ان اسباب و محرکات کا بھی قلع قمع کیا جائے جو انتہاپسندی کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کو شرفِ انسانیت کا اعزاز، شرافتِ تہذیب کی خیرات اور تحسین معاشرت کی سوغات صرف اُس وقت نصیب ہوئی، جب حضور سیّدعالم صلی اللہ علیہ وسلم

اس دنیا میں تشریف لائے۔

آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے، عرب کے جاہلی معاشرے میں جس وقت رسولؐ رحمت کی بعثتِ مبارکہ ہوئی تو احوال و کیفیات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ اُس معاشرے کی نمایاں ترین خصوصیّت انتہاپسندی تھی۔ جس طرح انسانی زندگی کے ہزار رنگ ہیں، انتہاپسندی کے انواع واقسام بھی بے شمار ہیں۔ تاہم سب دائروں کا مرکز مذہبی انتہاپسندی میں مرتکز تھا۔ مذہبی انتہاپسندی کا سب سے بڑا مظہر شرک و بت پرستی تھا اور شرک و بت پرستی کا محور و مرکز اُس گھر کو بنا دیا گیا تھا جو اصلاً اللّٰہ کا گھر، خدا پرستی کا مرکز اور نشرگاہِ توحید تھا۔ توحید اللّٰہ کی وحدانیت و یکتائی ہے۔ بے مثل، بے عیب، وحدہٗ لاشریک وہی ہے۔ یکتا وتنہا ذات مالک الملک ذوالجلال والاکرام وہی ہے۔ تصورِ حقانیت اور حقیقت میں عدل وقسط کی نمایندہ توحید ہے، جب کہ شرک ایک سے زیادہ بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں خداؤں کا یقین خلافِ حقیقت بھی ہے اور ذہنی، تصوراتی انتہاپسندی بھی ہے۔ نیز جہالت وظلم کی نمایندہ ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمٰن ۳۱:۱۳)۔

عرب جاہلیّت میں انتہاپسندی اگرچہ ذہنی وعملی ہزار شکلوں میں موجود تھی لیکن اس کا سب سے بڑا مظہر مذہبی انتہاپسندی کی صورت میں نمایاں تھا۔ چنانچہ حضور نبی کریمؐ کا اپنے مخاطبین، یعنی مشرکینِ مکہ سے ایک یہی تو مطالبہ تھا کہ وہ صرف ایک کلمہ (توحید/ اسلام) کا اقرار کرلیں تو عرب وعجم کی بادشاہی ان کے قدموں میں ہوگی۔ یہ ایک کلمۂ توحید/کلمۂ اسلام ان کی انتہاپسندانہ مشرکانہ زندگی پر خطِ تنسیخ پھیر رہا تھا۔ وہ بلبلا اُٹھے۔ وہ کلمہ، اس کی دعوت، اس کے اثرات، اس کے تقاضے ان کے مذہبی شب وروز، ان کی معاشرتی زندگی، ان کے معاشی فوائد، ان کی بداخلاقیاں، سب کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہورہے تھے۔ شرک بقول قرآن ظلم ہے، اس لیے مشرکوں ظالموں نے انفرادی طور پر موحد اہلِ ایمان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جس سے خود ذاتِ رسالت مآبؐ بھی مستثنیٰ نہ تھی۔ پھر اجتماعی طور پر انتہاپسندی کا مظاہرہ چھے سال بعد ہی مشرکین مکہ، یعنی قریش نے اس طرح کیا کہ نہ صرف حضورؐ بلکہ بنومطلب سمیت پورے خاندانِ بنوہاشم کا معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کردیا۔ اس ظالمانہ سلوک اور اجتماعی انتہاپسندی کا سلسلہ تین سال تک برابر جاری رہا۔ ایسے ظالمانہ سلوک اور انتہاپسندی کی اس سے پہلے عربی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن جب

کفارو مشرکین مکہ کی معاندانہ کوششوں اور ظالمانہ کارروائیوں کے باوجود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی مساعی نے مدینہ میں بھی کامیابی حاصل کرلی تو کفارو مشرکین کی انتہاپسندی عروج پر پہنچ گئی، اور انھوں نے دارالندوہ کے ایک خصوصی اجلاس میں آقاے رسالتؐ کے قتل کا منصوبہ بناڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر آپؐ تقدیر و تدبیر الٰہی کے تحت شمشیر بردار مشرکوں کے محاصرے سے ہجرت کی رات بخیرو عافیت نہ نکل جاتے تو انھی لمحات میں دہشت گردی کا ایک بہت بڑا واقعہ ظہور پذیر ہو جاتا۔

ہجرتِ نبویؐ کے بعد ریاست مدینہ قائم ہوجانے اور قوت و شوکت حاصل ہونے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشِ مکہ کی انتہاپسندی کا جواب انتہاپسندی سے نہیں دیا، بلکہ ایک محتاط، معتدل، ترقی یافتہ معاشرے کی داغ بیل ڈالی اور اس کا عملی نمونہ سب سے پہلے خود اُس مدنی معاشرے کی ازسرِنو تبدیلی سے فرمایا جہاں آپؐ نے قدم رنجہ فرمایا تھا اور جہاں انتہاپسندانہ مزاجی حالات نے اس خطے کے باشندوں کے لیے جہنّم زار بنادیا تھا۔ آپؐ کی آمد اور آپؐ کی مساعیِ جمیلہ سے مدینہ طیبہ، جنت نشان قرارِ جاں بن گیا۔ اس خوش گوار تبدیلی کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ط (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۳) اور یاد کرو احسان اللہ کا، اپنے اُوپر، جب کہ تھے تم آپس میں دشمن، پھر اُلفت دی تمھارے دلوں میں، اب ہوگئے اس کے فضل سے بھائی بھائی، اور تم تھے کنارے پر ایک آگ کے گڑھے کے، پھر تم کو اس سے نجات دی۔ (ترجمہ شیخ الہند)

حضور نبی کریمؐ نے یثرب کی اُس سرزمین کو (جہاں بدامنی، قتل و غارت گری، لاقانونیت کا دور دورہ تھا، جہاں کسی کی جان، مال، عزت و آبرو محفوظ نہ تھی، جہاں اوس و خزرج اور یہودی قبائل ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے، جہاں نراج کی حکمرانی تھی اور انتہاپسندی عام تھی) امن و امان کا گہوارہ بنادیا۔ عدل و احسان کی حکمرانی سے متمتع کیا۔ ایک قانون اور ایک دستور کا پابند کیا۔ ہر قسم کی انتہاپسندی کو ممنوع ٹھیرایا۔ خوں آشام قبائل کو شیر و شکر کیا، نراج کو راج سے بدلا، ایک مرکز عطا کیا۔ اخلاق، مروّت، اخوت، اعتدال کی فضا قائم کی۔ پوری بستی کے حدود کو حرم قرار دیا

اور ایک شہر بے مایہ کو تاجدارِ مدینہ نے مدینہ بنا کر مفتخر [فخر کرنے والا] کیا۔ اب جو اُمت تشکیل پائی وہ 'اُمتِ وسط' قرار دی گئی۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ ۲:۱۴۳) (اور اس طرح ہم نے تم کو اُمت وسط/ اُمت معتدل بنایا ہے)۔ اُمت معتدل، موضح القرآن کے مطابق: ''وہ اُمت ہے جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ عیسائیوں نے افراط اختیار کی کہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا بنا دیا اور یہودیوں نے تفریط دکھائی کہ ان کی پیغمبری کو بھی نہ مانا۔ اُمت معتدل نے نہ ان کو حد سے بڑھایا نہ گھٹایا بلکہ ان کے درجے پر رکھا'' (حاشیہ ف م جالندھری، ص ۳۵)۔ حاشیۂ عثمانی کے مطابق: وسط، یعنی معتدل کا یہ مطلب ہے کہ یہ اُمت ٹھیک سیدھی راہ پر ہے جس میں کچھ بھی کجی کا شائبہ نہیں اور افراط وتفریط سے بالکل بری ہے'' (ص ۲۷)۔ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: الوَسَط (بفتح السین) اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو دو مذموم اطراف کے درمیان واقع ہو، یعنی معتدل جو افراط وتفریط کے بالکل درمیان ہوتا ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ معنی اعتدال کی مناسبت سے یہ لفظ عدلٌ نصفة سواءٌ کی طرح ہر عمدہ اور بہترین چیز کے لیے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ اس معنی میں اُمت مسلمہ کے متعلّق فرمایا گیا۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ ۲:۱۴۳)۔ (راغب اصفہانی، ص ۹۷۴)

یہ کہنا گویا عین حقیقت ہے کہ اُمت مسلمہ یا مسلمانوں کا بحیثیت اُمتِ وسط دائرۂ حیات اعتدال وتوسط کے گرد ہی گھومتا ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں کارفرمائی میانہ روی کی ہے، تاکہ انفرادی واجتماعی زندگی کا ہر گوشہ توازن وہم آہنگی سے ہم کنار ہو اور کسی قسم کی بے اعتدالی، ناروا زیادتی، غلو اور انتہاپسندی سرزد نہ ہونے پائے۔ دین اسلام کی یہ ایسی بنیادی صفت ہے کہ حضور اکرمؐ سے پہلے آنے والے تمام انبیاؑ ورسل بھی اس اہم مقصد کے لیے کوشاں رہے کہ عدل وقسط قائم ہو، اور کتب وصحائف کا نزول بھی اسی غرض سے ہوا کہ لوگ راستی ومیانہ روی کو اپنی زندگیوں میں جاری وساری کریں (ملاحظہ ہو سورۂ حدید ۵۷، آیت ۲۵)۔ آپؐ کا لایا ہوا دین تو سرتاسر عدل وقسط، اعتدال واقتصاد (میانہ روی) کا آئینہ دار ہے۔ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جہاں اس کی کارفرمائی نہ ہو یا اسے نظرانداز کردیا گیا ہو۔ درحقیقت اس دین فطرت میں ظاہر وباطن کا ہرجلوہ، اور فکر وعمل کا ہر ذرّہ مبنی برعدل ہے، اور جلوہ ہائے نبوت سے ہم آہنگ ہے۔ بروایت

حضرت عبداللہ بن سرجسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حسنِ سیرت (نیک چال چلن)، بُردباری اور میانہ روی نبوت کے اجزا میں سے ۲۴واں حصّہ ہے''۔(ترمذی، مشکوٰۃ)

قرآن وحدیث میں مسئلہ زیر بحث کے دونوں پہلوؤں پر جگہ جگہ احکام و ہدایات سے نوازا گیا ہے۔ اس پہلو سے بھی کہ عدل و اعتدال، اقتصاد و میانہ روی اختیار کی جائے جو اس بات کو مستلزم ہے کہ فکر وعمل کی ہر چیز اور نظام و انتظام کا ہر عنصر اپنے اپنے دائرے میں ٹھیک ٹھیک کام کرے اور مطلوبہ مثبت نتائج پیدا کرے، دوسری طرف کسی معاملے میں حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اعتدیٰ، عدوان، طغیان وعصیان سے پرہیز کیا جائے کہ یہیں سے غلو، تجاوزِ بے جا اور انتہاپسندی کی مختلف جہتیں پیدا ہوجاتی ہیں جو اپنی سنگینی میں دہشت گردی سے مماثل ہوجاتی ہیں۔

اسلام کا مزاج بہرحال اور بحیثیت مجموعی، قسط واعتدال سے ہی عبارت ہے کہ یہ تعمیر باطن بھی کرتا ہے اور ظاہر کو بھی درست رکھتا ہے۔ حکم ہے: اِعۡدِلُوۡا ۟ هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى (المائدہ ۵:۸) ''عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے''۔ دل میں کھوٹ اور ناجائز خواہشات ہی بے راہ روی و بے اعتدالی کی پرورش کرتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا: فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰٓى اَنۡ تَعۡدِلُوۡا (النساء ۴:۱۳۵) ''لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو''۔ اللہ تو بہرصورت عدل کی ہی تلقین کرتا ہے: ''ان سے کہو، میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے''۔ (الاعراف ۷: ۲۹)۔ اس لیے اہلِ ایمان کو اس کی تابعداری لازم ہے۔ کیونکہ اللہ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے، ان سے محبت رکھتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ۝ (الحجرات ۴۹:۹، المائدہ ۵:۴۲، الممتحنہ ۶:۸)۔ سورۂ لقمان میں فرمایا گیا کہ وَاقۡصِدۡ فِىۡ مَشۡيِكَ (لقمٰن ۳۱:۱۹) ''چال میں میانہ روی اختیار کرو''۔

یہ میانہ روی زندگی کے ہر معاملے، ہر گوشے میں مطلوب ومحمود ہے۔ ارشاد رحمۃ للعالمینؐ ہے: ''حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خوش حالی میں میانہ روی کیا ہی خوب ہے، ناداری میں اعتدال کی روش کیا ہی اچھی ہے، اور عبادات میں میانہ روی کیا ہی بہتر ہے'' (مسند بزاز، کنزالعمال)، (عبدالغفار حسن، انتخابِ حدیث، ص ۶۲)۔ یہ روش، یہ رویہ ہر لحاظ سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔ یہ ارشاد رسالت مآب کیسا معنی خیز ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

دین آسان ہے۔ کوئی شخص دین سے زور آزمائی نہ کرے کیونکہ یہ دین اس پر غالب آ کر رہتا ہے۔ اس لیے سیدھے رہو۔ میانہ روی اختیار کرو اور ہشاش بشاش رہو (ایضاً، ص ٦٦، ٦٧)۔ ایک اور حدیث قدسی میں ہے کہ ''مومن کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے''۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ مومن اپنے آپ کو ذلیل کیسے کرتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ناقابلِ برداشت (طاقت سے زیادہ) آزمایش میں خود اپنے آپ کو ڈالتا ہے۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

اس لیے یہ بات طے ہے کہ انصاف اور اعتدال و میانہ روی ترک کرنے سے ہی انتہاپسندی کو فروغ ملتا ہے۔ انتہاپسندی، اعتدیٰ، عدوان، ہرصورت میں منع ہے۔ چنانچہ مختصر الفاظ میں مگر جامع انداز میں یہ حکم دے دیا گیا کہ وَ لَا تَعْتَدُوْا 'حد سے آگے نہ بڑھو' (المائدہ ۵:۸۷)۔ سورۂ بقرہ میں یہ مضمون کئی جگہ بیان ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (البقرہ ۲:۲۲۹) ''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں سو اس سے آگے مت بڑھنا''۔ اور دوسری جگہ فرمایا گیا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ○ (البقرہ ۲:۱۹۰) ''بے شک اللہ حد سے آگے بڑھ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔ انتہاپسندی کی مذمت دوسرے الفاظ میں اس طرح کی گئی: وَ لَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ○ (ھود ۱۱:۱۱۲) ''اور حد سے تجاوز نہ کرنا، اللہ تمھارے سب اعمال کو بخوبی دیکھ رہا ہے''۔ یہی حکم سورۂ طٰہٰ میں مکرر دیا گیا (طٰہٰ ۲۰:۸۱)۔ حدود سے تجاوز کرنے والوں (للطاغین) سرکشوں کو بُرے ٹھکانے کی وعید سنائی گئی ہے (صٓ ۳۸:۵۵)۔ یہی وعیدِ جہنّم سورۂ نبا (۷۸:۲۲) میں بھی مذکور ہے۔ مذہبی انتہاپسندی تو اور بھی زیادہ دین و دنیا دونوں جگہ خسارے کا باعث ہوسکتا ہے۔ لہٰذا یہود و نصاریٰ، اہلِ کتاب کو سرزنش کرتے ہوئے گویا اہلِ ایمان کو بھی تنبیہ کردی گئی کہ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِيْنِكُمْ (النساء ۴:۱۷۱) ''اپنے دین کے معاملے میں حد سے آگے نہ بڑھو، غلو سے کام نہ لو''۔ نیز دین میں غلو یا انتہاپسندی میں دوسرے لوگوں کے آلۂ کار بننے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ یہ بھی احتیاط ضروری ہے کہ کسی ظلم و زیادتی اور انتہاپسندی کے کاموں میں نہ تو کسی سازش اور منصوبہ بندی کا حصّہ بنیں۔ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المجادلہ ۵۸:۹)، اور نہ اس قسم کے کاموں میں مدد و تعاون بہم پہنچائیں۔

تعلیماتِ نبویؐ سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی انتہاپسندی کی وہ شکل و صورت جو بظاہر

بڑی معصوم ہے اور جس میں کسی دوسرے کا نقصان بھی نہیں ہے، لیکن بہرحال اعتدال سے تجاوز اور غلو پایا جاتا ہے، اس لیے وہ بھی شرعاً ممنوع ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر اس قسم کی کسی بے اعتدالی کی خبر ملتی تو آپؐ اس کا فوری نوٹس لیتے اور اصلاحی تدابیر اختیار فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمر بن العاصؓ کے بارے میں جب ہمہ تن مصروفِ عبادت ہونے کی اطلاع ملی تو ان کو فوراً بلا بھیجا۔ بخاری کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اے عبداللہ! کیا مجھے یہ اطلاع نہیں ملی ہے کہ تم دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات کو قیام کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، ایسا ہی کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ طرزِ عمل اختیار نہ کرو۔ روزہ رکھو اور افطار بھی کرو، رات کو تہجد بھی پڑھو اور آرام بھی کرو۔ اس لیے کہ تمھارے بدن کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے(بخاری، مشکوٰۃ)،(عبدالغفار حسن، انتخابِ حدیث، ص ۶۸-۶۹)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھے کو دیکھا کہ وہ اپنے دو بیٹوں کے درمیان پاؤں گھسیٹتے ہوئے جا رہا ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: اسے کیا ہوگیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ اس نے نذر مانی ہے کہ بیت اللہ کا سفر پیدل کرے گا۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص کے اپنے آپ کو اذیت دینے سے بے نیاز ہے۔ اور اسے حکم دیا کہ وہ سواری پر سوار ہوکر اپنا سفر پورا کرے۔ (ایضاً)

بخاری و مسلم کی ایک اور حدیث میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ایک مسجد (البیت) میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ چھت کے کنڈوں سے بندھی ایک رسی لٹک رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ماھذا الحبل؟ یہ رسی کیسی ہے؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ (ایک عورت) زینب نے اپنے لیے لٹکا رکھی ہے کہ جب تھکن سے اونگھ آنے لگتی ہے تو اپنے آپ کو اس سے لٹکا لیتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا: اس کو فوراً کھول ڈالو۔ تم میں کوئی اس وقت تک نماز پڑھے جب تک کہ نشاط و فرحت رہے، جب اونگھ آنے لگے تو اسے چاہیے کہ سو جائے۔ (امام نووی، ریاض الصالحین، ص ۵۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات انتہاپسندی کا ارتکاب لاعلمی میں یا نادانستہ طور پر

بھی ہوجاتا ہے، اور بعض اوقات کچھ نادیدہ محرکات وقتی جذبات و احساسات کے تحت بھی انتہاپسندی سرزد ہوجاتی ہے۔ حاصلِ گفتگو یہ کہ انتہاپسندی اور غلو چاہے اس کی نوعیت، شکل اور اظہار کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، دین کے نزدیک بہرحال پسندیدہ اور مستحسن نہیں، بلکہ اس کے خاتمے کے لیے شعوری کوششوں کی ضرورت ہے اور مذہبی انتہاپسندی کا امتناع تو بدرجہ اولیٰ لازم ہے۔ مگر یہ احتیاط لازم ہے کہ انتہاپسندی کی نوعیت و ماہیت کو پہلے سمجھ لیا جائے۔ اس لیے کہ کسی مقصد کے لیے جدوجہد، تحریک، ترغیب اور تخریب کے خطوط بہت قریب سے گزرتے ہیں اور دفع و استیصال کے لیے پہلے حکمت و تدبیر اور تحمل کو کام میں لانا چاہیے اور آخری چارۂ کار کے طور پر طاقت کا استعمال کرنا چاہیے، کیونکہ اس بات کا بہت اندیشہ ہے کہ نشۂ طاقت ہی کہیں خرابی کا باعث نہ بن جائے ؏

صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک

حواشی

۱- ملاحظہ ہو: ظلم حد سے گزرنا ہی ہے: وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ ؕ (الطلاق ۶۵:۱) وَ مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ ۲:۲۲۹) ۔غلو بھی حد سے گزرنا۔ غلا یغلو غَلواً وغُلُواً، مبالغہ کرنا، حد سے بڑھنا (المنجد، ص ۸۸۶)۔ قرآن میں ہدایت ہے: یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (النساء ۴:۱۷۱)۔ اور فرمایا گیا: قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (المائدہ ۵:۷۷)۔ طغٰی طغا طغی طغیاً وطغیاناً طُغواً وطغوا وطغواناً- جاوزالقدر والحد۔ حد اور اندازہ سے تجاوز طغیان ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسٰیؑ کو فرعون کی طرف یہ کہہ کر بھیجا گیا: اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی (طٰہٰ ۲۰:۲۴) ''تم فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ حد سے زیادہ بڑھ چکا ہے''۔ گویا حدود فراموش، حدود شکن، سرکش ہوگیا ہے۔ پھر حضرت موسٰیؑ و ہارونؑ دونوں کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دوبارہ انھی الفاظ میں مذکور ہے۔ اِذْھَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی (طٰہٰ ۲۰:۴۳)۔ یہی تکرار سورۃ النازعات میں بھی (۷۹:۱۷) ہے۔ حدود شکنی، سرکشی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی (العلق ۹۶:۶) ۔ قومِ ثمود و فرعون کا جرم سرکشی و حدود شکنی ہی تھا۔ الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ (الفجر ۸۹:۱۱) جو فتنہ وفساد کا موجب ہوتا ہے۔ فَاَکْثَرُوْا فِیْھَا الْفَسَادَ (الفجر ۸۹:۱۲)۔ اس لیے حکمِ ربانی یہ ہے روزمرہ

باتوں (مثلاً کھانے پینے) میں بھی حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ وَ لَا تَطْغَوْا (طٰہٰ ۲۰:۸۱) اعتدیٰ اور عداون۔ دونوں کا ماٰخذ و مادہ ایک ہے عدو (ع دو)۔ علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ العدو کے معنی حد سے بڑھنے اور باہمی ہم آہنگی نہ ہونا ہے۔ اگر اس کا تعلّق دل کی کیفیت سے ہو تو یہ عداوۃ اور معاداۃ کہلاتی ہے اور اگر رفتار سے ہو تو اسے عدوۃ کہا جاتا ہے۔ اور اگر عدل و انصاف میں خلل اندازی کی صورت میں ہو تو اسے عُدوان اور عدوٌ کہا جاتا ہے۔ (اصفہانی، امام راغب، مفردات القرآن، محمد عبدہٗ الفلاح الفیروز پوری، المکتبۃ القاسمیہ، لاہور۔ طبع اوّل، ۱۹۶۳ء، ص ۲۰۳)۔ اعتداء، حد سے آگے بڑھنا یا بقول علامہ راغب حق سے تجاوز کرنے کے ہیں (ایضاً)۔ حکم ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں ان سے تجاوز نہ کرو (البقرہ ۲:۲۲۹)۔ حد سے نکلنے والے عادون (مومنون ۲۳:۷) اور معتدین ہیں جن کو اللہ پسند نہیں کرتا (البقرہ ۲:۱۹۰، نیز المائدہ ۵:۸۷، الاعراف ۷:۵۵)۔ ظلم و زیادتی میں حد سے گزرنا عدوان ہے۔ زیادتی کا بدلہ لینے میں بھی عدوان سے پرہیز کا حکم دیا گیا (البقرہ ۲:۱۹۳، النساء ۴:۳۰)۔ بقول امام راغب الافراط کے معنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر جانے کے ہیں۔ اور سورۂ کہف (آیت ۲۸) میں یادِ الٰہی سے غفلت میں پڑنے والا خواہشِ نفس کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ جانے والا (وکان امرہٗ فُرطاً) ہے (ایضاً، ص ۲۹۸)۔ یعنی افراط و تفریط میں حد سے بڑھا ہوا۔ (ایضاً)

مقالہ نگار شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی میں پروفیسر رہے۔

توسیع وتعمیر مرکز جماعت فنڈ

محترم امیر جماعت نے مندرجہ بالا فنڈ کے قیام کے سلسلے میں ذمہ داران/ کارکنان اور ہمدردان کے نام ایک خط لکھا تھا جو گذشتہ شمارے میں شائع ہوا۔ رقوم کی ترسیل کے لیے بنک کا اکاؤنٹ نمبر اس میں درج نہیں تھا۔ بعض احباب کے استفسار پر اس طرف توجہ ہوئی۔ چنانچہ اصحاب خیر مندرجہ ذیل اکاؤنٹ نمبر میں اپنے عطیات جمع کروائیں:

توسیع وتعمیر مسجد

آن لائن اکاؤنٹ نمبر: 0113122376013

بنام: الیاس احمد فاروقی/ ساجد انور/ مظہر محمود صدیقی/ رشید احمد

البرکہ بنک پاکستان لمیٹڈ مین برانچ، B-95، حالی روڈ گلبرگ II، لاہور

صدر کمیٹی جامع مسجد منصورہ

توسیع وتعمیر مرکز

آن لائن اکاؤنٹ نمبر: 0100841706

بنام: مجلس احیائے اسلام

میزان بنک لمیٹڈ گلبرگ برانچ، 60- مین بلیوارڈ گلبرگ، لاہور

ناظم شعبہ مالیات